اُن دونوں کی حیات صرف اس لیے تھی کہ وہ ایک اختتام کے منتظر تھے...اور اسے حیات نہیں محض انتظار کہا جاتا ہے..

دونوں دراصل اپنی اپنی حیات بسر کر چکے تھے..

ایک شب جب وہ اپنے اپنے مخصوص صوفوں پر بیٹھے بہت دیر سے ایک دوسرے سے لاتعلق، ٹیلیویژن کے اَسّی چینل کلک کلک کرنے کے بعد کسی ایک چینل پر بھی کوئی ایسا پروگرام نہ پا کر جو دیکھنے کے لائق ہو وہ ایک دوسرے سے ہم کلام ہوئے..

''رُودین..''

''ہاں میں سن رہا ہوں..''

''زندگی کیا ہے؟''

''بس یہی..''

''اور کیا خدا ہے؟''

یہ وقت سے پہلے بوڑھی ہوگئی ہے..شائد پچھتاتی ہے کڑھتی ہے کہ وہ یہاں کیوں آئی ایسے سوال پوچھتی ہے جو کم از کم ایک سید زادی کو تو نہیں پوچھنے چاہئیں..کم از کم عمر کے اس حصے میں..

''اُس کا بھید تو آج تک کوئی نہیں پا سکا..دانش اور شعور کی کائناتوں کے مالک اس بھید کی جستجو میں خوار ہوئے، میں تو اُن کی نسبت ایک ذرّے سے بھی کمتر ہوں تو بھلا میں تمہیں کیا بتاؤں کہ وہ ہے یا نہیں''

''میں تمہیں بتا سکتی ہوں..''

''ہاں..کہو''

''زندگی..رفاقت' ہمسائیگی اور عشق کے سوا کچھ بھی نہیں''

''اور خدا؟''

''وہ تم خود ہو..'' وہ ایسے بیان دے رہی تھی جیسے اُسے اپنی صداقت پر مکمل یقین ہو''تم..''

''میں..''

''ہاں..تم..ایک وجود..تم جس بھی عقیدے پر قائم ہو جو محض تم نے وراثت میں حاصل کیا ہے..صدق دل سے اُس پر ایمان رکھتے ہو تو اُس عقیدے کا خدا تم خود تخلیق کرتے ہو..اور وہ خدا ہوتا ہے..''

''ورنہ نہیں ہوتا..''

''نہیں..صرف ماننے والا اُسے یہ درجہ دیتا ہے..بلکہ عطا کرتا ہے..افراد کی تعداد اُس خدا کی بڑائی کا تعین کرتی ہے..''

''غم حسین بھی کیا ایک خدا ہے؟''

''ہاں ہے..میرے لیے ہے''

''اور اس کے باوجود تم ایک صلیب اٹھائے پھرتی ہو..''

''ہاں..منصور کا انا الحق یہی تھا..میں نے اُس کے ترجمہ شدہ خطوط پڑھے ہیں جو امریکہ میں روحانیت کی تلاش میں بھٹکتے' کبھی گورو رجنیش اور کبھی مولانا رُوم کے کلام میں پناہ لینے والوں میں بے حد مقبول ہیں..اُس کے خطوط پڑھ کر اُس کا ''میں ہی حق ہوں'' پر یقین رکھنا قریب از قیاس لگتا ہے رُودین..اگر اُس نے مجھے بنایا ہے' بھیجا ہے اور تخلیق کیا ہے اور مجھ میں وہ دانش پھونکی ہے جو مجھے ایک صلیب پہنا دیتی ہے' ایک رُودین کے لیے زندگی وقف کر دینے یا شاید ضائع کر دینے پر مجبور کر دیتی ہے تو یہ سب کچھ اُسی کا کیا دھرا ہے..اگر وہی کوزہ گر ہے تو کوزے کو کیا اختیار کہ وہ کون سی شکل اختیار کرتا ہے' اُسے جیسے ڈھالا گیا وہ شکل اختیار کرتا چلا گیا..اور پھر اُس نے اُس کوزے کو زندہ کیا..کیسے؟ اپنی رُوح پھونک کر..تو وہ کوزہ کیا ہوا؟ وہ کوزہ گر کی ذات کا ایک پرتو ہوا' ایک ذرّہ ہوا..تو اُس ذرّے میں اگر اُس کی پھونک ہے تو گویا وہ خود ہے..تو وہ ذرّہ اگر اپنے آپ کو اُسی کا ایک حصہ سمجھ لے تو اس میں اُس کا تو کوئی دوش نہیں..''

اُس کے گمان میں بھی یہ نہ تھا کہ نتالیہ اپنی سوچ اور جستجو میں اتنی آگے نکل گئی ہے..کہیں ایک ڈھلتی عمر کے رُودین کے لیے سب کچھ چھوڑ کر آ جانا محض ایک بہانہ تو نہیں..اور وہ دراصل کسی اور تلاش میں ہے..اُس کے اندر کوئی اور کُھدبُد ہے جس نے اُسے ہر شے یہاں تک کہ اولاد کو بھی تیاگ دینے پر مجبور کر دیا ہے اور وہ محض ایک بہانہ ہے..اُس کی کوئی حیثیت نہیں' اُس کا اصل عشق جس کے ہاتھی تلے وہ روندی جا چکی ہے' کھوج ہے..

''یہ سب کچھ اتنا سادہ اور آسان نہیں نتالیہ..ورنہ ہم دونوں سے پیشتر جو کھربوں لوگ گزر چکے وہ کسی نہ کسی نتیجے پر پہنچ ہی جاتے..اور وہ نہیں پہنچے اس لیے ہم بھی بھول بھلیوں میں گم ہیں''

''تم نے غم حسین کا ذکر کیا تھا.. ہاں.. یہ مجھے آسودگی دیتا ہے..اُس کے لیے آنسو بہاتی ہوں تو میرے دُکھ کم ہوتے ہیں..اُس کی بے بسی کا تصور کرتی ہوں تو میرا بدن کانپنے لگتا ہے..مجھے اُس کا آسرا چاہیے..میں خاک کربلا کا ایک ذرّہ ہوں..وہی جو اپنے اندر پھونکی ہوئی پھونک سے شہ پا کر''انا الحق'' کا نعرہ لگاتا ہے..''

''تو ہر کوئی جو اس دنیا میں سانس لیتا ہے ہر فرد اپنا خدا خود تخلیق کرتا ہے؟''

''نہیں ہر شخص قادر نہیں ہوتا..بیشتر لوگ جہالت اور حماقت میں گم اس جہان سے گزر جاتے ہیں اور چند ایک ہوتے ہیں جو اُس کی پھونک کو محسوس کر لیتے ہیں..وہ ہمیشہ کے لیے فنا ہو جاتے ہیں اور اُن کے لیے کوئی روز حشر نہیں ہوتا اور جو سوچتے اور سمجھتے ہیں اور محسوس کرتے ہیں اُن کے لیے ایک اور زندگانی ہوتی ہے''

''تمہیں مکمل بھروسہ ہے کہ تم اُن لوگوں میں سے ہو جو...''

''ہاں..اس لیے کہ اس لمحۂ موجود میں میں تم سے اُس کوزہ گر کی باتیں کر رہی ہوں جس کی پھونک میرے اندر مجھے یہ حوصلہ دیتی ہے..میں ہوں اُن لوگوں میں سے...''

وہ بہت کم باہر نکلتے..

نتالیہ ایک ایسا کھنڈر تھی جس کی ہر بُھرتی مسمار ہوتی اینٹ کو وہ نہایت انہماک کے ساتھ صاف کرتا جھاڑتا تھا اور اُس کی قدامت کا اندازہ کرتا تھا لیکن اُس کا بُرش بار بار اُس کی صلیب پر اٹک جاتا تھا اور اُس کی تہہ تک نہیں پہنچ پاتا تھا..کانونٹ کے ٹھنڈک بھرے برآمدوں اور راہباؤں کے لبادوں کی سرسراہٹ میں..اور اپنے بابا کی خانقاہ میں سلگتی اگربتیوں کے مرغولہ دھویں

میں سانس لینے والی لڑکی...اب ایک ڈھلتی عمر کی عورت اتنے ذرّوں میں بکھر چکی تھی..اور ہر ذرّے میں کوزہ گر کی پھونک بھری تھی..وہ اتنی بکھر چکی تھی کہ اُسے سمیٹنا کم از کم اُس کے لیے تو ممکن نہ تھا..

وہ بہت کم باہر نکلتے

نتالیہ ایک پرندہ تھی..

وہ اُس جھیل پر آ گری تھی جہاں پرندے مرنے کے لیے آ جاتے ہیں..

یکدم آسمان سے گر پڑی تھی..

اُس کے پاس' اس گھر میں اور اپنے بستر پر پھڑ پھڑاتی تھی..وہ الگ الگ کمروں میں نیند کرتے تھے..ایک دوسرے سے پوشیدہ..جھیل الگ اور وہ پرندہ الگ جو اُس میں مرنے کے لیے اتنی دُور سے آیا تھا..

راتوں کو وہ اُس کی آہٹ سنتا تھا..وہ اپنے کمرے میں چلتی پھرتی تھی' اپنے بچھڑے ہوئے بچوں سے باتیں کرتی تھی..وہ اُس کے بیڈروم کے دروازے کے ساتھ کان لگائے سنتا تھا لیکن اندر نہیں جاتا تھا' اندر ایک سیدزادی تھی جس کا احترام اُس پر واجب تھا..وہ بچوں سے باتیں کرتی تھی اور پھر یکدم طویل خاموشی میں چلی جاتی تھی..وہ سوچتا شائد سوگئی ہے' جانے کو ہوتا تو پھر اُس کی آواز آنے لگتی لیکن سرگوشیوں سے بھری اور حیرت در حیرت وہ پچیس برس پیشتر اُسے لکھے جانے والا کوئی خط دوہرا رہی ہوتی جیسے وہ خط اُس کے سامنے دھرا ہو اور وہ اُسے پڑھ رہی ہو..کسی کو سنا رہی ہو..

جھیل الگ اور پرندہ الگ..

وہ ایک ایسی جھیل تھا جس پر ایک پرندہ مرنے کے لیے آ گیا تھا..
پرندے کے گلے سے ایک صلیب لٹکتی تھی..
وہ دُور دیسوں سے لمبی اُڑانیں کرتا منطق الطیر کے پرندوں کی مانند صحراؤں سمندروں اور بیابانوں پر اُڑتا بڑی دِقت سے اُس جھیل تک پہنچا تھا... مرنے کے لیے..

نتالیہ کو مرے ہوئے کئی روز ہو چکے تھے..
اُس کی موت کی کوئی تفصیل نہ تھی.. یہ بتا دینا کہ موت ہو چکی ہے اور پھر اُس کی تفصیل بیان کرنا حماقت ہے.. ڈرامے کا اختتام پہلے سے بتا دینا اور پھر تماشائیوں کو تھیٹر ہال میں دو گھنٹے بٹھائے رکھنا حماقت ہے..
نتالیہ اُس سے اگلی سویر مردہ ہو چکی تھی جب پہلی بار اُن دونوں کے درمیان سوائے صلیب کے کچھ حائل نہ ہوا تھا..
اُس نے جب شیر دھاڑا تھا تو درست کہا تھا کہ وہ ایک سیلاب کی زد میں آ گیا تھا.. اُس میں اس قدر پانی تھے پچیس برس کی شادی شدہ زندگی کے رکے ہوئے پانی جن کو بہاؤ نصیب نہیں ہوا تھا.. ناخوشی کے بند کے روکے ہوئے.. اُس کا وجود ان پانیوں میں کھو چکا تھا اور وہ کناروں کو محسوس نہیں کر پا رہا تھا.. اس سیلاب میں ڈوبتے ہوئے چاندی کی صلیب ہی وہ تنکا تھی جس کا سہارا وہ لے سکتا تھا..
وہ اُس کی قربت میں سمٹی لرزتی تھی اور اُس کی سانسیں اُکھڑتی ہوئی لگتی تھیں..
''میں ٹھیک ہوں..'' جب اُس نے فکرمندی سے کہ بے ربط اور اُکھڑتی سانسوں میں فرق

ہوتا ہے اُس کے شانے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا تھا کہ نتالیہ تم ٹھیک تو ہو. تب اُس نے جواب دیا تھا..

''رُودین..''

''ہاں...''

''میرا نام لو..''

''نتالیہ..''

''رُودین.. شیر دھاڑتا ہے.. اُس کی دھاڑ میرے قریب آتی چلی جاتی ہے''

ہر سُو خاموشی تھی..

شہر کے ہول کے درمیان رات کے اس پہر ایسا سناٹا تھا کہ اگر ایک مردہ پرندہ بھی اُن کے درمیان آ گرتا تو اُس کے گرنے کی آواز بھی پورے شہر پر اپنے مُردہ پَروں کے ساتھ سائیں سائیں کرنے لگتی.. ایسا سناٹا تھا..

''میں اُس سنہری بالوں والے اجنبی کو دیکھ رہی ہوں جو اُس شب بابا کے ڈیرے پر سر جھکائے بیٹھا تھا.. ذرا میری اُنگلیاں.. اس نے اپنا ہاتھ اُس کے چہرے پر پھیلا دیا'' ان میں سے ادرک اور لہسن کی بُو ابھی تک آ رہی ہے ناں.. جو انہیں چُومتی ہوئی مریدنیاں چھوڑ جاتی تھیں.. سونگھو''

اور اُن میں وہ تھی.. بہت واضح بہت تازہ ''ہاں نتالیہ''

''میں اپنے کانونٹ کے برآمدوں میں چل رہی ہوں.. راہباؤں کے لبادوں کی سرسراہٹ میرے گالوں کو چھوتی ہے لیکن وہ فوارہ دُھندلاہٹ میں ہے.. میرا خیال ہے کہ وہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا سفید مجسمہ تھا یا مریم بی بی کا تھا..''

''تم ٹھیک ہو ناں..''

''ہاں.. تم کیوں بار بار پوچھ رہے ہو کہ میں ٹھیک ہوں..''

''تمہارا بدن بری طرح لرزش میں ہے نتالیہ اور تمہارے سانس..''

''شائد اس لیے رُودین کہ کہ مجھے آج تک کسی ذی رُوح نے نہیں چھوا اور اب میں تم سے جُڑی ہوئی ہوں.. یاد ہے شادی کی رات جب میں نے خواہش کی تھی کہ میں کسی غیر مرئی اور جناتی عمل سے اُس لمحے تم تک پہنچ جاؤں اور کہوں کہ Do not spare me.. تو یہ وہی لمحہ ہے.. میں تم تک پہنچ چکی ہوں.. And you did not spare me, thank you.. رُودین..''

وہ ایک ہذیانی کیفیت میں بولتی چلی جارہی تھی۔ کبھی مسرت کے ایک مختصر وقفے میں چُپ ہوتی۔ کبھی لحظہ بھر کے لیے اُس کا منہ کھل جاتا اور وہ پھر بولنے لگتی۔۔

''تم تو جانتے ہو کہ میرے بال کتنے گھنے اور سیاہ ہوا کرتے تھے ایڑھیوں تک آتے تھے بنگالنوں کی طرح۔۔ یہ میری بیماری کی نذر ہو گئے۔۔ تو یہ بال اس لمحے پھر سے اتنے ہی گھنے سیاہ اور لامبے ہو گئے ہیں۔۔ یہ اب میرے بدن تلے آ گئے ہیں اور حرکت سے کھنچتے ہیں اور مجھے تکلیف دیتے ہیں۔۔ ہٹو اور مجھے حالت بدلنے دو۔۔۔ کسمسا کر ان بالوں کو سنبھالنے دو۔۔ شیر دھاڑ رہا ہے رُودین۔۔''

''ہر سُو چُپ ہے۔۔''

''یہ شیر بھی ایک اعلان کرتا ہے رُودین۔۔ جیسے ازمنہ قدیم میں قصبے کے کلیسا کا گھڑیال بے وقت بجنے لگتا تھا تو لوگ جان جاتے تھے کہ یہ کسی موت کی منادی کر رہا ہے۔۔ خبر پہنچا رہا ہے۔۔ اعلان کر رہا ہے۔۔ شیر کی دھاڑ سے میرے واحد پہناوے صلیب میں ارتعاش جنم لے رہا ہے۔۔ مجھے بہر طور اپنے گناہوں کی پاداش میں مصلوب ہو جانا ہے۔۔''

ملاپ کی یہ رسم بھی آخری رسوم کی مانند ادا ہوئی۔۔ اُس نے صلیب کی چبھن کو اپنے سینے میں گُھبتے ہوئے یوں محسوس کیا جیسے اُسے داغا جا رہا ہے۔۔۔ اُس کے سانس بھی اُکھڑے نہیں بے ربط ہوئے اور پھر بحال ہو کر اُس نے الگ اور پرے ہو کر اُس نتالیہ کے چہرے کو دیکھا۔۔

اس یک بدنی کے عالم میں ہی وہ اُس سے الگ ہو چکی تھی۔۔

اُس کے نین نقش زردی میں تھے۔۔

منہ کھلا تھا ایک پیاسے پرندے کی مانند۔۔ اُس کے دانت اور مسوڑھے بھی زردی میں تھے۔۔ اُس کے چہرے پر بہت سے خط نقش تھے جن کا ایک ایک حرف پڑھا جا سکتا تھا۔۔

ان تمام واضح علامات کے باوجود اُسے کچھ گمان نہ ہوا کہ اگلے روز عصر کی نماز کے فوراً بعد وہ اپنی مٹھیوں سے مٹی بھر بھر کر اُس کی قبر کو نمایاں کرنے کی کوشش میں مصروف ہو گا۔۔

''تمہیں پتہ ہے کہ میں جھول رہی ہوں۔۔ برنے کے پیڑ کی بلند ترین شاخوں کو میری ناک چھوتی ہے۔۔ اور جب بھی میں جُھلا رالے کر وہ پینگ جھولتی ہوں تو میرے گلے میں آویزاں وہ صلیب بھی اُس سے لمحہ بھر کے لیے الگ ہو کر جھولتی ہو۔۔ اور مجھے جھلاتا کون ہے۔۔ تم اور کون۔۔ تم ہی میرے جُھلارے ہو۔۔ اتنی چاہت اور قوت سے میری پینگ کے رسّے تھام کر زور لگاتے ہو کہ میں

بلند ترین شاخوں سے پرے آسمان کی نیلاہٹ کو جا چھوتی ہوں.. میں نے اپنے سارے پانی تمہارے لیے ہی تو روک رکھے تھے.. تم مجھے اسی طور جھلاتے رہو.. ایسے جھلاؤ کہ میں برنے کے پیڑ کی شاخوں اور پتوں میں سے نکل کر آسمان کی نیلاہٹ کو چھوتے ہوئے واپس نہ آؤں' اُس میں چلی جاؤں اور جب جھولا واپس آئے.. تم اپنے بازو وا کیے مجھے ایک اور جھلارا دینے کے لیے بازو وا کیے کھڑے ہو تو پینگ واپس آئے تو خالی ہو.. جولاہی وہاں نہ ہو"

اُس کا بازو دُکھنے لگا..

نتالیہ کا سر بہت دیر تک اُس کے بازو پر آرام کرتا رہا..

دُکھان بازو کی جب اُس کی برداشت سے باہر ہوگئی تو اُس نے اپنا بازو کھینچ لیا تو نتالیہ کا سر ڈھلک گیا..

کسی بھی مردہ جسم کو دفنانے کی رسوم سے وہ مکمل طور پر نا آشنا تھا..

نتالیہ یوں بھی مُردہ نہ لگتی تھی' ڈھلکے ہوئے سر کے ساتھ آرام کرتی ہوئی لگتی تھی.. نیند میں لگتی تھی..

وہ اپنے برسوں سے رُکے ہوئے پانیوں میں نہا چکی تھی اس لیے شائد اُسے نہلانے کی بھی حاجت نہ تھی..

ایک موت کی تفصیل میں جانا اگرچہ حماقت ہے لیکن.. ایسا ہو گیا ہے..

''ہاں آپ کے نام کا ایک خط ہے صاحب...''

''نہیں..یہ..یہ کیسے ہوسکتا ہے..''

''جی صاحب ہے ناں..لفافے پر آپ کا نام درج ہے..''

محمد علی ڈاکیے کی انگلیوں میں ایک لفافہ تھا جو وہ ایک مدھم آہستگی سے اُس کی جانب بڑھا رہا تھا..

''نہیں..''

''آپ نے خود ہی تو پوچھا تھا صاحب کہ میرے نام کا کوئی خط ہے..تو ہے''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ..''

''یہ ہوگیا ہے صاحب..'' ڈاکیے کے چہرے سے مسکراہٹ سمٹی اور اُس کے لہجے میں پہلی بار درشتگی آئی ''خود ہی پوچھتے ہو کہ میرے نام کا کوئی خط ہے..اور جب ہے تو خود ہی کہتے ہو کہ نہیں...''

''میں نے تمہیں اپنا نام نہیں بتایا تو تم کیسے جانتے ہو کہ یہ خط...میرے ہی نام کا ہے؟''

''آپ نے مجھے اپنا نام بتایا تھا..آپ کو یاد نہیں رہا..اور میں بھی اُسے بھول گیا ہوں لیکن یہ جو خط ہے یہ آپ ہی کے نام ہوسکتا ہے کیونکہ اس ایک خط کو مجھے اسی مقام پر...اسی لمحے پہنچانے کو کہا گیا ہے..آپ خود دیکھ لیجیے کہ اس پر آپ کا نام ہے یا نہیں..''

انگوٹھے اور چاروں انگلیوں کے درمیان بھنچا ہوا لفافہ اُس کی جانب آہستہ آہستہ بڑھ رہا تھا اور اُس کی آنکھیں حیرت سے بڑی ہوتی گئیں کہ اُس پر اُسی کا نام لکھا تھا..

''اسی مقام پر..اس لمحے تمہیں یہ خط پہنچانے کو کس نے کہا تھا؟''

''پوسٹ ماسٹر صاحب نے..''

''کون سے پوسٹ ماسٹر نے؟''

''وہی جن کے ہاتھ میں مہر ہے..جو بڑے پوسٹ آفس میں بیٹھتے ہیں..اُن کا کام ہی یہی ہے ایسے خطوں پر مہریں لگانا..میں تو ہرکارہ ہوں''

''تم جانتے تھے میں وادی شگر سے پرے خوبانیوں سے حاملہ ہوتے ہوئے ایک زرد درخت سے پرے اس پہاڑی نالے کے پار اس لمحے موجود ہوں گا؟''

''نہیں..''

''تو پھر..''

''میں نہیں مگر پوسٹ ماسٹر صاحب جانتے ہیں..وہ سب جانتے ہیں..اگرچہ وہ کبھی اپنے پوسٹ آفس سے باہر نہیں نکلے لیکن وہ سب جانتے ہیں..آج تک کبھی ایسا نہیں ہوا کہ انہوں نے مجھے کوئی خط پہنچانے کے لیے سونپا ہو اور مجھے یا بندہ کے بارے میں بتایا ہو کہ وہ اس لمحے اس تاریخ کو فلاں جگہ پر موجود ہوگا اور...وہ موجود نہ ہوا ہو..''

''اس کا مطلب ہے کہ تم نے اور کئی خط بھی پہنچائے ہیں''

''ہاں..''

''کتنے خط..''

''جتنے یا بندہ ہیں..''

''کتنے ہیں؟''

''حساب کتاب صرف پوسٹ ماسٹر کے پاس ہے..آپ یہ خط وصول کر کے مجھے فارغ کرو میں نے واپس بھی جانا ہے''

''کہاں؟''

''اپنے پوسٹ ماسٹر کے پاس...''

ڈاکیے کے انگوٹھے اور چاروں انگلیوں کی گرفت میں آیا ہوا وہ لفافہ ہولے ہولے اُس کے قریب آ رہا تھا لیکن اُس نے اسے وصول کرنے کے لیے اپنا ہاتھ نہیں بڑھایا تھا کیونکہ اُس خط اور اس کے ہاتھ کے درمیان...ایک دیا سلائی بھڑکتی تھی...ایک بندوق فائر ہوتی تھی..دُور دیس میں ایک قبرستان کی خالی زمین پکارتی تھی..پیٹ پر ایک گھاؤ تھا..ایک مُردہ شاعر کی انگلیوں کا لمس

تھا..کوٹھڑی میں بند جولاہے کی سفید داڑھی کے بال کھیس میں بُنے جاتے تھے..ایک سیدانی کے گلے میں لٹکتی چاندی کی صلیب تھی اور ایک جولاہی برنے کے پیڑ کے جھولے میں جھولتی آسمان میں نکلتی تھی اور جھولا خالی واپس آ رہا تھا..کہیں یہ خط..

''اور اگر میں یہ خط وصول کرنے سے انکاری ہو جاؤں تو..''

''یہ آپ کے اختیار میں نہیں ہے..یہ خط تو آپ وصول کر چکے ہیں یہ تو محض کارروائی ہے..''

اُس کا ہاتھ اُس کے بس سے باہر ہوا' اُس کے پہلو سے جدا ہو کر اُٹھا اور اُس لفافے کی جانب بڑھنے لگا..

ایک ایسی مسکراہٹ ڈاکیے کے چہرے پر پھیلی جو...اُس کے بس میں نہ تھی..یہ مسکراہٹ ایک روٹین ایک ڈیوٹی لگتی تھی جو صرف یہ کہتی تھی کہ جو ہونی ہے وہ ہو کر رہتی ہے...میں ہمیشہ ڈاکیے کے چہرے پر تب پھیلتی ہوں جب کوئی بے بس اور بے اختیار اس خط کو وصول کرنے کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے..

کہاں تو وہ شدید گھبراہٹ میں تھا خط کو وصول کرنے سے انکاری تھا اور کہاں یہ کہ یکدم اُس کی گھبراہٹ ایک بدنی انبساط میں بدلی...جیسے حیاتی کی تمامتر کھٹنائیوں میں اُس کے تمامتر مسام آنکھوں کی مانند کھلے صرف اسی خط کی راہ دیکھتے تھے...یہ وہی آخری انعام تھا جس کا وہ منتظر تھا..ڈاکیا اُسے ایک شفیق دوست نظر آنے لگا..ایک محسن دکھائی دیا جس نے اسے انتظار کی اذیت سے نجات دلائی تھی..جس نے پھانسی کا پھندا عین اُس لمحے اُس کی گردن سے نکال لیا تھا جب وہ جھول جانے کو تھا..وہ ایک عجیب کیف میں مبتلا ہوا جیسے کسی مقدس صحیفے کے نزول کا لمحہ ہو..جیسے محبت کے پہلے بوسے کی شرماہٹ ہو..جیسے پہلے بچے کے پیدا ہونے کی نوید ملے یا بے اختیار ہونے سے پیشتر بدنی گیلاہٹ کا سناٹا ہو..

اُس کی انگلیوں نے جونہی لفافے کو چھوا' ڈاکیے کی مسکراہٹ برف میں بدل گئی..منجمد ہو گئی..

لفافے پر اُسی کا نام تھا' تاریخ' لمحہ اور مقام پتے کے طور پر درج تھا اور تحریر مکمل طور پر نا آشنا اور اجنبی تھی..

وہ اُسے کھولنے لگا تو ڈاکیے کا ہاتھ آگے آ گیا ''نہیں..یہاں نہیں..جشوپی کے سیبوں

کے باغوں کی جو ڈھلوان دریائے برالڈو تک اُترتی ہے وہاں اُس کے کناروں پر جا کر اسے کھولنا کہ اس میں جو کچھ درج ہے وہ اُس دریا کے پانیوں کی لمس سے ہی نمایاں ہوگا..ورنہ نہیں'' یہ کہہ کر محمد علی ڈاکیا پتھرا سا گیا' زندہ نہیں لگتا تھا' اور جب وہ اپنے بدخشانی گھوڑے پر سوار ہوا تو یوں لگا جیسے وہ گھوڑا بھی پتھر کا ہو اور پھر وہ دونوں..سوار اور سواری..اسی پتھریلی حالت میں نزدیکی چٹانوں کا ایک حصہ بن گئے..

وہ یکسر تنہا ہو گیا..

سرد ہوا کی سرسراہٹ سے اُس کے کانوں کی لویں یخ ہونے لگیں..

اُس کا ہاتھ ابھی تک اُسی حالت میں بڑھا ہوا تھا جس حالت میں اُس نے وہ لفافہ وصول کیا تھا اور وہ لفافہ اُس کی انگلیوں میں ایک شکار ہو چکے پرندے کے تازہ تازہ مُردہ ہو چکے بدن کی ہلکی حدّت لیے اپنے کبھی زندہ ہونے کی آخری خبر دے رہا تھا..

اُس کے جی میں آئی کہ وہ خط یہیں کھول لے..لیکن وہ جان گیا کہ یہ بھی اُس کے اختیار سے باہر ہے..

اُسے وہ خط کھولنا تھا تو وہیں کھولنا تھا..حشوپی کے سیبوں کے باغوں سے اُترتی ڈھلوان کے آخر میں جہاں دریائے برالڈو کے پانی بہتے تھے کہ یہی ڈاکیے کی ہدایت تھی اور بغیر کسی شک وشبہ کے یہ ہدایت پوسٹ ماسٹر کی جانب سے آئی تھی جس سے رُوگردانی ممکن نہ تھی..

وہ اُسے..اُس خط کو اُسی حالت میں بڑھے ہوئے ہاتھ میں تھامے..اُسی حالت میں جس حالت میں اُس نے اُسے ڈاکیے سے وصول کیا تھا..تھامے حشوپی کے سیبوں کے پستہ قد زمین پر بچھتے ہوئے درختوں میں سے گزرتا دریا کے کناروں تک آ گیا..

کیا اُسے صرف کنارے تک ہی رہنا ہے یا دریا کے مرکزی بہاؤ کی قربت میں جانا ہے..قربت میں جانا ہے..

وہ اُسی کیف اور مستی میں تھا..دریا کنارے..انبساط اور لطف کی حالت میں..لفافہ تھامے..کنارے کے قریب پانی میں اُبھرے ہوئے پتھروں پر قدم دھرتا جن کے اردگرد پانی وحشت میں مرغولے بنتے گرداب ہوتے تھے وہ اُن پتھروں پر قدم رکھتا..مرکزی بہاؤ کے قریب ہو گیا جہاں دریا اپنے جوبن میں تھا..کسی رکاوٹ کو خاطر میں نہ لاتا تھا اپنے من کی موج میں بہتا چلا جاتا تھا..

اور اُس کے پانیوں میں.. جہاں وہ بے دریغ اور کھلے ہو کر بہتے چلے جاتے تھے اُسے محسوس ہوا کہ اُن میں رُوحیں بہتی تھیں.. گیلے' ڈوبے اور اَن ڈوبے پتھر زندہ لگتے تھے' سانس بھرتے سنائی دیتے تھے..

یہ شاہ گوری کی اُلفت میں اُس کے سرد مرگ بوسوں کی چاہت میں مبتلا اس کی آخری بلندی تک پہنچنے میں ناکامی کے بعد یا کبھی کامیابی کے بعد اجل کا شکار ہونے والے عشاق کی رُوحیں تھیں جو یہاں تک چلی آئی تھیں..

بہتی ہوئی چلی آئی تھیں..

انہیں دیکھا بھی جا سکتا تھا لیکن تبھی جب تمہارے عشق کی حدّت اُن عشاق کی محبت کے درجے تک پہنچ جائے..

دریا کے پتھر.. جو کناروں میں اُبھرے ہوئے تھے کائی زدہ اور پھسلواں نہیں تھے کہ ان پر یا ان کے آس پاس پانی ٹھہرتے کہاں تھے.. اُنہیں ذرا سا تراشتے ہوئے نکل جاتے تھے.. ایک دھیمی گونج کی سمفنی کانوں میں اُنڈیلتے..

آج تک جتنی بھی تتلیوں نے پَر کھولے تھے.. ان پر اُڑان کی تھی.. کہیں سنولیک سے.. کہیں اشکولے سے آئی تھیں' جن جن نے اس کے پانیوں پر پرواز کی تھی....

اِن پر جھک کر آج تک جتنے بھی لوگوں نے جتنے سانس لیے تھے.. اپنی پیاس بجھانے کے لیے.. محبت کرتے ہوئے.. خودکشی کرنے ان میں ڈوبنے سے پہلے آخری سانس.. وہ سب سانس..

اور چہرے اس پر جو جو جھکے تھے.. اس کے پانیوں سے اپنے آپ کو تر و تازہ اور زندہ کرنے کے لیے.. اپنی عشق آتش سرد کرنے کی خاطر.. وہ سب چہرے.. جتنے بھی پیاسے پرندوں نے اپنی چونچیں ان میں ڈبوئی تھیں.. وہ سب چونچیں..

جو پتّے خزاں رسیدگی کے ہاتھوں مجبور.. خزاں کے تانبے رنگوں میں رنگے اپنی ٹہنیوں سے جدا ہو کر اِن پر آن گرے تھے.. سب پتّے..

برف کے جتنے بھی گالے سرمائی یخ بستگیوں کے موسموں میں.. اپنی برفیلی آہستگی کے ساتھ ان پر.. ان پانیوں پر گرے تھے آ گرے تھے اور اُسی لمحے ان میں تحلیل ہو گئے تھے.. سارے کے سارے گالے..

ہوائیں جو برف گرنے سے پیشتر سنسناتی' درّوں اور چٹانوں کے شگافوں میں سیٹیاں بجاتی گزرتی ان تک آئی تھیں تو اپنے زور سے ان میں ہیجان پیدا کرتی تھیں اور پھر ان کے بہاؤ پر بچھ جاتی تھیں..وہ ہوائیں!

کہیں بلندیوں پر معلق پہاڑی راستے جو مسمار ہو کر ان میں آ گرے تھے..یہ سارے راستے!

اوپر ان پانیوں کے وجود کے عین اوپر کھسکتی چٹانوں کے انبار جو ان میں آن گرے.. چند لمحوں کے لیے بہاؤ میں رکاوٹ ہوئے اور پھر ان میں فنا ہو گئے..وہ ساری کی ساری چٹانیں!..

بھربھری مٹی میں جنم لینے والے پہاڑی بُوٹے اور بلندی کی تیز مہک والی جھاڑیاں جن کی جڑیں تیز بارشوں نے ننگی کر دی تھیں وہ بھی آبی ریلوں کی زد میں آ کر ان میں آ گری تھیں..سبھی بوٹے اور جھاڑیاں..

صرف آج اور کل نہیں..جب بکھرے ہوئے زمینی حجم آپس میں ٹکرائے تھے اور ان کے ملاپ کی شدت سے پہاڑ ابھرے اور نمودار ہوئے تھے اور لاکھوں برسوں میں ذرّہ ذرّہ اونچے ہوتے ہوئے اتنے بلند ہو گئے تھے کہ اُن پر برفیں گرنے لگی تھیں..وہ آج بھی بلندی کی جانب ذرّہ ذرّہ اُبھرتے تھے' تھمے نہیں تھے' ایک خاموش تسلسل سے اونچے ہوتے جا رہے تھے..دریاؤں نے راستے بدل لیے تھے' کبھی میدانوں میں رواں تھے تو اُنہوں نے ان پہاڑوں میں اپنی جگہ بنالی تھی..تو تب جب دریائے برالڈو پہلی بار بلند چٹانوں کے درمیان میں پہلی بار بہا تھا..

تب سے آج تک..

جتنی بھی تتلیوں نے اس کے بہاؤ پر پَر کھولے تھے..لوگوں کے سانس اور چہرے پرندوں کی چونچیں' تانبے رنگ کے گلتے سڑتے پتے..برف کے گالے..پہاڑی راستے' ہوائیں' چٹانوں کے انبار' تیز مہک والی جھاڑیاں' بُوٹے جو اس میں گرے تھے..وہ سب کے سب..وہ جتنے بھی تھے..جونہی اس کی قربت میں ہوئے' اس میں آن گرے' اس پر جھکے..تو وہ سب کے سب پتھر ہوئے..یہی پتھر..برالڈو کے پانیوں کی تہہ میں دکھتے' کناروں پر کبھی ڈوبتے کبھی دکھائی دیتے پتھروں پر وہ سب نقش ہوئے..اُن کے چہرے' پَر' مہک اور مہاندرے ان پتھروں پر ثبت ہو گئے..اُن کے وجود کی مہریں لگ گئیں..سب پتھر ہوئے..

اسی لیے ان پتھروں پر قدم رکھتے ہوئے احتیاط کہ کہیں کوئی تتلی کچلی نہ جائے پتھر

ہو جانے کے باوجود اُس کی کوملتا اُس کی نازکی برقرار ہو اور وہ کچلی نہ جائے.. کسی پرندے کی چونچ نہ زخمی ہو ٹوٹ نہ جائے.. برف کا کوئی گالا اپنا وجود کھو نہ دے.. ہوائیں تھم نہ جائیں بے شک وہ پتھر کی ہوں.. کوئی تیز مہک والی جھاڑی اپنی مہک نہ کھو بیٹھے.. اور کوئی چہرہ گم نہ ہو جائے کوئی سانس بند نہ ہو جائے.. اس لیے ان پتھروں پر قدم دھرتے ہوئے احتیاط.. از حد احتیاط.. پتھروں پر نقش اور ثبت شدہ شباہتوں اور محسوسات کا یہ عجائب گھر دریا کے کناروں اور اُس کے پانیوں کی تہہ میں سجا تھا.. یہ نقش اور شباہتیں ہر آنکھ کے لیے نہ تھے' صرف اُسے ہی دکھائی دیتے تھے جن کے نام.. ایک خط آتا تھا' جن کے لیے پوسٹ ماسٹر محمد علی ڈاکیے کو کسی مخصوص مقام اور وقت پر پہنچنے کی تلقین کرتا تھا.. اور تاکید کرتا تھا.. صرف اُسے ہی یہ عجائبات سنگ دکھائی دیتا تھا ورنہ باقیوں کے لیے وہاں کچھ بھی نہ تھا.. بیکار پتھر تھے.. بنا کسی نقش کے اندھے اور عام پتھر تھے..

اُس نے اپنے بیٹھنے کے لیے ایک ایسا پتھر چنا جس پر.. ایک پتھر کا ہی نقش تھا کہ دریا میں سب سے زیادہ پتھر ہی تو گرتے تھے..

تادیر.. اُس کے بہاؤ کی جانب دیکھنا دشوار تھا.. دیکھا ہی نہ جاتا تھا کہ وہ اتنا تیز اور مسحوریت سے حاملہ تھا کہ تادیر دیکھنے سے انسان خود بھی اس کے ساتھ بہہ جاتا تھا..

اُس کے ہاں اب بھی ایک ایسا دروازہ کھلا تھا جس کے راستے وہ فرار ہو سکتا تھا..

اگرچہ بقول محمد علی ڈاکیے کے اُس خط کو.. جو ابھی تک اُس کے ہاتھ میں اُسی حالت میں موجود تھا جس حالت میں وہ وصول کیا گیا تھا.. وہ اُسے وصول کرنے پر مجبور تھا بے بس تھا لیکن اُسے کھولنا تو اُس کے اختیار میں تھا.. وہ اسے نہ کھولے' یونہی پوشیدہ اور مقفل حالت میں اُسے سپرد آب کر دے یہ تو اس کے اختیار میں تھا.. لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ ہر انسانی بدن میں تجسس' چنتا اور کھوج کا لاوا تو ازل سے بھر دیا گیا تھا.. کیا ہے؟.. کیا نہیں ہے.. اگر ہے تو کیا ہے.. اور کیوں ہے.. اور اگر کچھ نہ ہوتا تو کیا ہوتا.. کیا خدا ہوتا.. یا نہ ہوتا.. وہ اگر اس خط کو کھولے بغیر سپرد آب کر دیتا تو وہ زندہ نہ رہتا.. اس کا تجسس اور افسوس اُسے مار ڈالتا کہ اُس میں کیا لکھا تھا.. کس کا لکھا تھا.. تو یہاں بھی ایک مجبوری اور بے کسی تھی تجسس کی.. اختیار نہ تھا..

جو نظر رکھتے ہیں وہ لفافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں.. پر یہ لفافہ کچھ بھی بھانپنے نہ دیتا تھا' کچھ ظاہر نہ کرتا تھا' اس پر درج نا آشنا تحریر سے یہ اندازہ لگانا بھی ممکن نہ تھا کہ یہ کسی نسوانی ہاتھ کے لکھے ہوئے حرف ہیں یا مردانہ خط ہے.. بھیجنے والا پتہ لکھنے کی گھڑی میں

اضطراب میں تھا' تذبذب میں تھا یا سرخوشی اور مسرت سے کانپتی انگلیوں نے اسے لکھا تھا.. یہ ایک بے رُوح اور سپاٹ سرکاری قسم کی تحریر تھی.. اُس کا نام.. وقت اور مقام.. بس!

لفافے پر کوئی ٹکٹ چسپاں نہ تھا مگر ایک واضح پڑھی جانے والی مہر ثبت تھی.. پوسٹ ماسٹر!

ریڑھ کی ہڈی کے اوپر گردن کے خم پر برف کا ایک گالا گرا اور اس کے بدن کی گرمی سے پگھل کر پانی کی ایک لکیر کی صورت رینگتا اس کے سرینوں تک چلا گیا.. اس آبی لکیر کی یخ بستگی سے اس کا بدن' محمد علی ڈاکیے کے بدخشانی گھوڑے کی جلد کی مانند تھرایا..

ابھی تو موسم گرما کا کیف چہار سُو تھا.. قمیض کے کھلے بٹنوں پر جو ہوا سرسراتی تھی وہ سینے کو خوشگوار کیفیت سے دوچار کرتی تھی اور ابھی پل دو پل میں موسم بدل گئے..

دریا کے پانی بھی اُترنے لگے.. کم ہونے لگے.. بلندیوں پر پگھلاہٹ نہیں ہو رہی تھی برف گر رہی تھی... یوں لمحوں میں وہ پتھر بھی عیاں ہونے لگے جو گہرے پانیوں میں ڈوبے اس سے قبل دکھائی نہیں دے رہے تھے.. وہ بھی سادہ نہ تھے اُن پر بھی سب کچھ نقش تھا..

تہہ کے سنگریزے نظر آنے لگے.. اور ان پر بھی.. اَن گنت سنگریزوں پر بھی ان کے حجم کے مطابق مختصر تصویریں سامنے آتی تھیں' ان کے رنگ ابھی گیلے تھے.. سانس' چہرے' چونچیں' پتے' بوٹے سب کے سب مصور کی تخلیقی صلاحیت کے گیلے مظہر تھے..

دریا میں جو کم کم پانی تھے ان کے چھینٹے کم کم اڑتے تھے کہ وہ انجماد کی حدوں کو چھوتے جیسے بہنے سے گریز کرتے تھے' آہستہ تر ہوتے چلے جاتے تھے.. تھمنے کو ہوتے اور ایک جھجک کے ساتھ پھر سے رواں ہو جاتے.. پر روانی اتنی مدھم تھی کہ تادیر تکتے رہنے سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ تھمے نہیں چل رہے ہیں..

ہواؤں کا کوئی شمار نہ تھا..

ان میں برف کے گالوں کی آمیزش انہیں گھنا اور سرد کرتی تھی.. اتنی تُند کہ اُس کا ہاتھ جو اسی حالت میں تھا' لفافے کو گرفت میں لیے ہوئے وہ ہاتھ بھی لرزنے لگا اور لفافہ جیسے اپنے آپ کو اُس کی انگلیوں سے آزاد ہونے کے لیے پھڑ پھڑانے لگا.. ہوائیں ایک بھوکے عقاب کی مانند پانیوں پر اُترتیں اور ان میں سے جو چند چھینٹے اُڑتے انہیں بے بس پرندوں کی طرح شکار کر لیتیں..

تند سرد یلی ہوائیں' برف کے گالے اور تھمتے رُکتے پھر سے رواں ہوتے پانی اور پہلی

بار دکھائی دینے والے پتھر اور سنگریزے جولاہے کے کھیس میں بُنے جا رہے تھے..

یہ اشارے تھے..

پوسٹ ماسٹر کی جانب سے خط کھولنے میں جو تاخیر ہو رہی تھی اس کے باعث اشارے تھے..واضح...!

وہ ابد تک یونہی ایک پتھر پر براجمان..لفافے کو انگلیوں میں تھامے...اسے کھولنے سے اجتناب کرتے ہوئے..موسموں کی اس لمحہ بہ لمحہ بدلتی شدت کو سہہ نہیں سکتا تھا..اس نے لفافہ چاک کیا' اس میں نفاست سے تہہ شدہ کاغذ کو نکالا' اس کی تہیں کھول کر اپنے نام آئے ہوئے خط پر پہلی نظر ڈالی..

کاغذ کورا تھا..

اس پر کچھ بھی درج نہ تھا..

سادہ اور کورا تھا..

پوسٹ ماسٹر نے اس کے ساتھ مذاق کیا تھا..

اور پھر یکدم اس کے ذہن کا ایک کونہ منور ہوا..یہ کورا نہیں ہے..اس میں جو کچھ تحریر ہے وہ صرف دریا کے پانیوں کے لمس سے ہی نمایاں ہوگا..ورنہ نہیں...محمد علی ڈاکیے نے یہی کہا تھا..

اُس نے کورے کاغذ کو جھک کر پانیوں کے مدھم بہاؤ میں ڈبویا اور مزید جھک کر اپنے ہاتھ کو منجمد ہو جانے کی کیفیت کو برداشت کرتے..جھک کر زیرِ آب کاغذ کی گیلاہٹ کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کہ دیکھیں اس پر کیا نمایاں ہوتا ہے..لیکن مدتیں بیت گئیں اور اُسے کچھ دکھائی نہ دیا..اس پر کوئی تحریر نہ اُبھری' وہ کورے کا کورا ہی رہا..پوسٹ ماسٹر نے اس کے ساتھ ایک بڑا مذاق کیا تھا' ڈاکیے نے جھوٹ بولا تھا..بہاؤ کی یکلخت تیزی نے کاغذ کو اس کی گرفت سے الگ کیا..گیلے کورے کاغذ کی ایک دھجی اُس کی انگلیوں اور انگوٹھے کے درمیان بھنچی رہ گئی اور بقیہ کاغذ اس کے بس سے باہر ہو گیا..لیکن وہ بہاؤ کی زد میں آ کر اُس کے ہمراہ بہا نہیں بلکہ وہ بھی سانسوں' چہروں' چونچوں' پتوں' بوٹوں اور پہاڑی راستوں کی مانند ایک پتھر پر حنوط ہو گیا..

اس کورے کاغذ کے حنوط شدہ نقش کی قربت میں محمد علی ڈاکیا تو نہ تھا البتہ اس کا بدخشانی گھوڑا تھا جو اس کے برابر کے پتھر پر کھڑا ہوا تھا..اس کی جلد ابھی تک تھرکتی تھی اور اس کے نتھنوں سے طویل مسافتوں کی بھاپ نکلتی تھی..